© rasailojaraid.com

تاثرات

۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو قیامِ پاکستان کے پچیس سال مکمل ہو جائیں گے۔ عام حالات میں یہ موقع خوشی و مسرت کا تھا۔ لیکن گزشتہ سال ملک کو جن تباہ کن حوادث سے دوچار ہونا پڑا، ان کے پیشِ نظر خوشی و مسرت کی کیا گنجائش ہے؟

۱۹۷۱ء کے نامبارک سال میں پاکستان کا وہ علاقہ، جہاں ملک کی اکثریت آباد تھی سخت رنج دہ حالات میں اور ایک خونیں کشمکش کے بعد، ہم سے جدا ہو گیا۔ وہاں ہماری بہادر فوج کو دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے، اور مغربی محاذ پر بھی ۱۹۶۵ء جیسی ہمیں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

بلا مبالغہ پاکستان کو اپنی پچیس سالہ تاریخ میں کبھی (آزادی کے ابتدائی کٹھن ایام میں بھی) اس طرح کی دل شکن اور پُر آشوب صورت حالات سے سابقہ نہیں پڑا جیسی سالِ گزشتہ میں رونما ہوئی۔ لامحالہ ہمارے دل زخمی ہیں۔ اور ڈھاکہ میں جو گزری، اس پر خون کے آنسو روتے ہیں لیکن ہماری مشکلات و مصائب کا دائرہ مشرقی خطے تک محدود نہیں۔ مغربی پاکستان میں بھی ایسے مسائل کی کمی نہیں جو ذرا سی ناعاقبت اندیشی سے سنگین صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

یوں تو سبھی آزاد، زندہ قوموں کو ہمیشہ کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار رہنا پڑتا ہے۔ (ذرا اُن مشکل مسائل پر نظر ڈالیے جو دنیا کے سب سے طاقتور ملک، یعنی ریاستہائے متحدہ امریکہ کو درپیش ہیں) اور مغربی پاکستان کے معاملات سلجھانے میں تو وہ غیر معمولی دشواریاں بھی نہیں جنھوں نے بُعدِ مکانی، لسانی اختلافات اور بعض عوامل و علل کی بنا پر مشرقی پاکستان کے متعلقہ امور کو لاینحل بنا دیا تھا، لیکن مشکل مسائل کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں پورے طور پر سمجھا جائے۔ ان کے اسباب و علل اور دوسری جزئیات سے واقفیت ہو۔ اور پھر ٹھنڈے دل سے معاملات کے سب پہلوؤں پر غور کر کے ان کا حل تلاش کیا جائے۔

دفعِ غم نیست جز بہ غم خوردن   چارۂ کار نیست جز کردن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسائل کے جمہوری اور خاطر خواہ حل کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے فریق کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ رواداری کا اصول پیشِ نظر رہے اور جبر و تخویف کی بجائے افہام و تفہیم سے کام لیا جائے۔ ہمارے ہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہر فرد اور ہر جماعت کو یہ زعم ہے کہ فقط وہی حق پر ہے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش ایک طرف، جو کوئی بال برابر ان سے اختلاف رکھے اس کی نیت اور دیانت پر حملے ہوں گے اور تمسخر و استہزا کے تیر چلائے جائیں گے۔ بالجملہ ہمارے باثر رسائل و اخبارات نے ایک ایسی فضا پیدا کر رکھی ہے جس میں اہم مسائل کا ٹھنڈے دل سے غیر جانبدارانہ اور تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر تجزیہ کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے۔ اس امر سے کہ مختلف سیاسی جماعتوں اور مکاتیبِ فکر کے اپنے اپنے ترجمان ہیں، قومی مشکل حل نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ سب اپنے جماعتی زاویہ ہائے نگاہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ جماعتی اختلافات سے بالاتر ہو کر قومی نقطۂ نظر سے اہم ملکی مسائل کو واقعاتی (OBSECTIVE) انداز سے پیش کرنے کی سہولتیں ہمارے ہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اس صورتِ حالات کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ بنیادی مسائل کا بھی ہمارے ہاں خاطر خواہ علمی تجزیہ نہاہیں ہوتا۔ ٹھوس معلومات کم سے کم ہیں۔ رائے زنی کی افراط ہے۔ اور ہر ایک گروہ کو اپنی رائے پر اصرار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فکری زندگی میں انتہائی انتشار کی کیفیت پائی جاتی ہے اور رواداری (جس کے بغیر جمہوریت پنپ نہیں سکتی) اور ذمہ دارانہ بحث و تمحیص کے فقدان سے اہم قومی معاملات میں بھی خیالات کی یکسوئی (CON SENSUS) پیدا نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں مارشل لا کے ڈر سے یا کسی دوسرے ہنگامی اقدام سے اختلافی آوازوں کو دبایا جا سکتا ہے لیکن اس طرح کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے اور موقع ملنے پر پہلے سے بھی زیادہ زور سے بھڑک اٹھتی ہے۔

سندھ میں زبان کے مسئلے نے جس طرح ایک خطرناک صورت اختیار کر لی، اس سے ہماری قومی کوتاہیاں ایک بار پھر بے نقاب ہو گئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو اور سندھی میں وہ بُعد نہیں جو اردو اور بنگالی میں ہے۔ دونوں اسلامی روایات کی عکاسی کرتی ہیں۔ دونوں میں عربی، فارسی الفاظ کثرت سے ہیں۔ دونوں کا رسم الخط قریب قریب ایک جیسا ہے۔ اس کے علاوہ عبوری آئین میں زبان کا مسئلہ بنیادی طور پر پہلے ہی حل ہو چکا تھا۔ اس [illegible] کا تقاضا تھا کہ پانچ علاقائی زبانوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ہر ایک کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ مگر آئین میں یہ مطالبہ رد کر دیا گیا۔ اور فقط اردو قومی زبان قرار پائی۔ لیکن صوبائی حکومتوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ قومی زبان کے ساتھ ساتھ مقامی ضروریات کے لیے ایک علاقائی زبان کی ترویج و ترقی کا بھی انتظام کریں۔ یہ فیصلہ دانشمندانہ تھا۔ اور زبان کے نازک مسئلے کا ایک حقیقت پسندانہ حل تھا۔ اب وہ حدود طے ہو گئیں جن کے اندر، خاص مقامی حالات کے تحت، علاقائی زبان کی حیثیت قرار پا سکتی ہے۔ سندھ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اردو صرف قومی زبان نہیں، بلکہ ایک وسیع طبقے کی مقامی زبان بھی ہے۔ (ہماری معلومات کی تشنگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حتمی طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ صوبہ میں سندھی، اردو اور دوسری زبانیں بولنے والوں کا صحیح تناسب کیا ہے!) سندھ بنیادی طور پر ایک ذوالّلسان صوبہ ہے۔ اور سندھی بل کی اس دفعہ میں کہ تعلیمی اداروں میں چوتھی سے بارھویں جماعت تک سندھی اور اردو دونوں زبانوں کی تعلیم لازمی قرار دی جائے، اس حقیقت کا عملی اعتراف موجود ہے۔ ان حالات میں اختلافی امور محض جزوی رہ جاتے ہیں۔ لیکن ہماری بدنصیبی کہ باہمی افہام و تفہیم سے طے کرنے کی بجائے انھیں اس طرح اچھالا اور ایسا طریقِ کار اختیار کیا گیا کہ صوبے کا امن و امان درہم برہم ہو گیا۔ متعدد قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ حالات کو قابو میں لانے کے لیے کراچی اور دوسرے شہروں میں مسلسل کرفیو لگانا پڑا۔ اور ہمارے بدخواہوں (مثلاً بی۔ بی۔ سی والوں) کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ شاید مغرب میں بھی اب وہی طوفان اٹھنے والا ہے جس نے مشرق میں پاکستان کا شیرازہ منتشر کر دیا۔

سندھ میں زبان کے سوال پر جو کچھ ہوا وہ افسوسناک ہے لیکن شاید اس سے بھی زیادہ رنجدہ امر یہ ہے کہ جن طور طریقوں کی بدولت ایک مسئلے کی باقیماندہ جزئیات نے یہ خطرناک صورت اختیار کر لی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے قومی کیرکٹر کا جزو ہو گئے ہیں: مسائل کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ نہ کرنا، رواداری کا فقدان، انتہا پسندی، انصاف اور خدا کے خوف کی کمی۔ جب تک ان رجحانات کا قلع قمع نہیں ہوتا، چھوٹے چھوٹے مسائل بحران کی صورت اختیار کرتے جائیں گے۔ اصل ضرورت ان رجحانات کے خاتمہ کی ہے۔ ایک قدیم شاعر کا ایک سیدھا سادا بلکہ اکھڑ قسم کا شعر ہے ؎

اے ناصحو، کچھ فکر کرو چاکِ جگر کا
بیہودہ، مرے چاکِ گریباں کو نہ چھیڑو

© rasailojaraid.com